POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 24-25 January 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI ZABAN (Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان

اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 23-01-2026 • Price: 5/- • 1-7 February 2026 • Issue: 5 • Vol:85

یکم تا ۷ر فروری ۲۰۲۶ء • شمارہ: ۵ • جلد: ۸۵

صحتِ زبان (۳۹)

رؤف پاریکھ

بِیڑا (بی ڑا) اُٹھانا اور بیڑا (بے ڑا) غرق کرنا

ایک لفظ ہے بِیڑا، اس کا تلفظ یائے معروف سے ہے یعنی بی ڑا۔ یوں کہیے کہ بِیڑا اور کِیڑا ہم قافیہ ہیں۔ بِیڑا (بی ڑا) اُٹھانا محاورہ ہے، لیکن بھائی لوگ اسے یائے معروف کے بجائے یائے مجہول سے یعنی بیڑا (بے ڑا) اٹھانا پڑھتے ہیں اور اس طرح زبان کا بیڑا (بے ڑا) غرق کرتے ہیں۔

محاورہ 'بِیڑا اٹھانا' میں جو 'بِیڑا' (بی ڑا) ہے وہ دراصل پان کا بِیڑا ہے یعنی پان کی گلوری۔ لیکن یائے مجہول سے جو بیڑا ہے (یعنی بے ڑا) وہ تو کشتیوں یا جہازوں کا ہوتا ہے اور محاورے میں بالعموم غرق ہوتا ہے یا کبھی پار بھی ہوجاتا ہے۔

احمد دین کے مطابق بِیڑا (بی ڑا) اٹھانا کی اصل یہ ہے کہ کسی زمانے میں رواج تھا کہ کوئی مشکل کام درپیش ہوتا تو سردار یا راجا سب کو جمع کرتا اور اس کام کی تفصیل بتاتا۔ پھر ہر ایک کے آگے خاص دان میں رکھ کر گلوری پیش کی جاتی یعنی پان کا بِیڑا رکھا جاتا اور جو اسے اٹھا کر کھا لیتا وہ گویا اس کام کی ہامی بھرتا[1] (جی ہاں! یہ 'ہامی' بھرنا ہے اور اسے 'حامی' بھرنا لکھنا غلط ہے)۔ گویا یہ اعلان اور اقرار ہوتا کہ یہ کام میں کروں گا۔ اب پان کا بِیڑا اٹھانے کی رسم تو ختم ہوگئی لیکن بِیڑا اٹھانا محاورہ بن گیا۔ اس کے معنی ہیں: کوئی ذمے داری لینا، کسی کام کا پکا ارادہ کرنا۔ کوئی صاحب کسی کام کا، بالخصوص مشکل یا اہم کام کا، ارادہ کریں یا کوئی ذمے داری اٹھائیں تو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس کام کا بِیڑا (بی ڑا) اٹھایا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ نے 'بِیڑا اٹھانا' کی سند میں ابراہیم ذوق کے اشعار دیے ہیں جو مفہوم کو زیادہ واضح کرتے ہیں کہ ان میں گلوری اور پان کا بھی ذکر ہے۔ کہتے ہیں:

گلوری پان کی غیروں کو تم کھلاتے ہو
ہمارے قتل کا بِیڑا مگر اٹھاتے ہو
چھپا کے پان یہ کس کے لیے بناتے ہو
ہمارے قتل کا بِیڑا کہیں اٹھاتے ہو

یائے مجہول سے بیڑا (بے ڑا) ایک الگ لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں جہازوں یا کشتیوں کا مجموعہ۔ بیڑا (بے ڑا) صحیح سلامت کنارے پر یا منزلِ مقصود پر پہنچ جائے تو کہتے ہیں بیڑا پار ہوگیا اور جب کوئی کام اچھی طرح سے ہوجائے تب بھی مجازاً کہتے ہیں بیڑا پار ہوگیا[2] اور کوئی کام بہت خراب ہوجائے یا کسی کام کا ستیاناس ہوجائے تو مجازاً کہتے ہیں کہ بیڑا غرق ہوگیا۔ کوئی مشکل کام کردے یا مراد بر لائے تو کہتے ہیں بیڑا پار کردیا اور کام کوئی خراب کردے، تباہ کردے تو کہا جاتا ہے کہ بیڑا غرق کردیا یا بیڑا ڈبو دیا[3]۔

ایک وضاحت بیڑا اور بِیڑا کے املا کے بارے میں بھی کردی جائے۔ بعض لوگ ان کے آخر میں 'ہ' لکھتے ہیں یعنی بیڑہ اور بِیڑہ، لیکن یہ درست نہیں۔ رشید حسن خان کے مطابق ان دونوں (یعنی یائے مجہول ہو یا یائے معروف) کے آخر میں الف لکھنا چاہیے، یہاں ہائے مختفی لکھنا درست نہیں۔ گویا درست املا بیڑا اور بِیڑا ہے[4]۔

زَبان یا زُبان؟

آج کل بعض لوگوں نے بغیر کسی دلیل یا ثبوت کے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ زبان اگر عضو یعنی جیبھ (tongue) کے معنی میں ہے تو زے پر زبر کے ساتھ زَبان ہے لیکن یہ اگر گفتگو، کلام، نطق یا بول چال کے معنی میں ہے تو زے پر پیش کے ساتھ زُبان ہے۔ لیکن یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔ 'زبان' فارسی کا لفظ ہے اور فارسی کی مستند لغات سے بھی یہ ظاہر ہے کہ لفظ زبان کے پہلے حرف (یعنی زے) پر زبر اور پیش دونوں کے ساتھ اس کا تلفظ کرنا درست ہے اور دونوں کو دونوں معنوں میں استعمال کرنا روا ہے۔ مثلاً فرہنگِ آنندراج کے مطابق: ''**زبان**، بالضم و بالفتح، ف [یعنی فارسی]، عضوی معروف و روزمرہ و این مجاز است و بہر دو معنی ترجمہ لسان و آنرا زفان ہم گویند[5]''۔ گویا پیش کے ساتھ بھی ہے اور زبر کے ساتھ بھی اور عضو کے مفہوم کے علاوہ بات چیت کے مفہوم میں بھی ہے نیز زبان کو فارسی میں زفان بھی کہتے ہیں۔ اسٹین گاس نے بھی زَبان اور زُبان (یعنی زے پر زبر اور پیش دونوں) لکھا ہے[6]۔ بعض فارسی لغات میں صرف زے پر زبر کے ساتھ زَبان لکھا گیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد معین نے اپنی لغت میں زَبان (رومن میں تلفظ zaban) دیا ہے اور اس کے دو مختلف املا یعنی زفان اور زوان بھی دیے ہیں[7]۔ فرہنگِ عمید نے بھی لفظ زبان کو صرف ''بفتحِ زا'' لکھا ہے اور اس پر اضافہ کیا ہے کہ ''زفان و زوان ہم گفتہ شدہ''[8]۔ یاد رہے کہ فارسی کی ایک قدیم اور معروف لغت فرہنگِ زفانِ گویا کے نام سے ہے جو بدر ابراہیم کی تالیف ہے اور جسے پروفیسر نذیر احمد صاحب نے دو جلدوں میں مرتب بھی کردیا تھا[9]۔ لغت نامۂ دہخدا نے 'زبان' کے اندراج میں قوسین میں 'زَ/زُ' دیا ہے، گویا دونوں درست ہیں اور برہانِ قاطع کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''در عربی لسان گویند و بضمِ اول ہم درست است''۔ پھر فرہنگِ نظام کے حوالے لکھا ہے ''چون در پہلوی باضمِ اول است باید در فارسی ہم جایز باشد''[10]۔ ('جائز' کا یہ املا فارسی میں رائج ہے لیکن اردو والے جائز لکھتے ہیں یعنی 'ی' کے بجائے ہمزہ، اور المنجد کے مطابق عربی میں بھی 'جائز' یعنی ہمزہ سے ہے)۔

اسی طرح اردو اور فارسی کی دیگر مستند لغات بھی زے پر زبر اور پیش کے ساتھ یعنی زَبان اور زُبان دونوں کو درست تلفظ قرار دیتی ہیں اور معنی کی خود ساختہ تخصیص (جیبھ اور کلام) کا کوئی جواز کسی لغت میں موجود نہیں ہے۔ اردو لغت بورڈ کی لغت نے بھی پیش اور زبر دونوں کے ساتھ دونوں معنوں میں درج کیا ہے[11]۔

احسان دانش کے مطابق 'زبان' زے پر زبر اور پیش دونوں کے ساتھ درست ہے[12]۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق:

''زبان: دلّی اور پورب کے بھی بہت سے علاقوں میں اول مضموم ہے لیکن اور جگہوں پر الف مفتوح سنا جاتا ہے۔۔۔ نور اللغات نے دونوں تلفظ دیے ہیں، فارسی میں بھی دونوں تلفظ ہیں۔ اردو کی حد تک کہا جاسکتا ہے کہ اول مفتوح زیادہ رائج ہے اور زبان سے متعلق محاوروں میں بھی اول مفتوح ہی بولا جاتا ہے''[13]۔

فاروقی صاحب کی مراد یہ ہے کہ اگر کہنا ہو کہ زَبان کھل گئی یا زَبان سنبھال کر بات کرو یا زَبان کو لگام دو تو زَبان یعنی زے پر زبر کے ساتھ ہی بولا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اردو اور فارسی دونوں میں زَبان (زے پر زبر)

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

اور زُبان (زے پر پیش) دونوں درست ہیں اور زبان سے متعلق اردو محاوروں میں اکثر زے پر زبر کے ساتھ زَبان ہی بولا جاتا ہے۔

شِکوَہ اور شِکوہ

بعض طالبِ علم اِن دونوں لفظوں میں کوئی فرق نہیں کرتے اور انھیں ایک ہی طرح پڑھتے ہیں یا ایک سمجھتے ہیں۔ لیکن دونوں میں بہت فرق ہے۔ شِکوَہ (شِک۔وَہ) میں کاف ساکن ہے۔ یعنی شِک کو الگ پڑھنا ہے اور 'وَہ' کو الگ۔ معنی ہیں: شکایت، گِلہ۔ یہ عربی کا لفظ ہے۔ اور یہ وہی لفظ ہے جو اقبال کی مشہور نظموں شکوہ اور جوابِ شکوہ کے عنوان میں ہے۔ شکوہ کرنا بھی اردو میں مستعمل ہے۔ اردو میں شکوہ ہوتا ہے، شکوہ کیا جاتا ہے یعنی اردو میں شکوہ مذکر ہے۔ اسی جوابِ شکوہ میں ایک شعر ہے:

کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور!
شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور

اسٹین گاس کی لغت کے مطابق اسے عربی میں شکوۃ بھی لکھا جاتا ہے[14]۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے لغاتِ روزمرہ میں لکھا ہے کہ اس کے عربی املا میں تو الف مقصورہ (یٰ) ہے یعنی عربی میں شکویٰ ہے اور شین کے نیچے زیر ہے[15]۔

اردو میں شکوہ (شین مکسور) ہے اور شکوہ کی جمع اردو میں قائم حالت میں 'شکوے' ہے اور مغیّرہ یا محرّف حالت میں شکووں۔ البتہ مغیرہ یا محرف حالت میں واحد کے لیے بھی 'شکوے' کا لفظ آتا ہے، جیسے غالب کا شعر ہے:

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

اقبال اور غالب کے منقولۂ بالا اشعار سے ظاہر ہے کہ شکوہ اردو میں مذکر ہے۔

یہ تو ذکر تھا شِکوہ (شِک۔وہ) کا لیکن شِکوہ (شِ۔کوہ) الگ لفظ ہے۔ یہ فارسی کا لفظ ہے اور اس میں شین کے نیچے تو زیر ہے لیکن اس میں واوِ مجہول ہے یعنی کاف کو ساکن نہیں پڑھنا بلکہ 'کو' کی آواز الگ سے سنائی دینی چاہیے اور اس لفظ کے آخر میں 'ہ' ملفوظی ہے یعنی اس کا تلفظ واضح طور پر اس طرح کرنا ہے کہ آخر میں 'کوہ' سنائی دے، گویا اس لفظ کا درست تلفظ شِ۔کوہ ہے۔ یہاں یہ وضاحت کردی جائے کہ اس کا ایک تلفظ 'ش' پر پیش کے ساتھ یعنی شُکوہ (شُ۔کوہ) بھی ہے[16] لیکن اردو میں عام طور پر 'ش' کے نیچے زیر ہی بولا جاتا ہے۔ شِکوہ (شِ۔کو۔ہ) کے معنی ہیں شان وشوکت، رعب ودبدبہ، جلال[17]۔

مغل بادشاہ شاہ جہاں کے ایک بیٹے (اور اورنگ زیب عالم گیر کے ایک بھائی) کا نام دارا شِکوہ (شِ۔کوہ) (Dara Shikoh) یا دارا شُکوہ (Dara Shukoh) ہے لیکن بعض طالب علموں کو دارا شکوہ (شک۔وہ) (Shikva) بولتے سنا ہے جو غلط ہے۔ اس میں 'شِ' کو الگ اور 'کوہ' کو الگ بولنا چاہیے۔

یہ لفظ شِکوہ (شِ۔کوہ) مرکبات میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے :شان وشکوہ۔ ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ اقبال کہتے ہیں:

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ اس میں ہیں ملوکانہ صفات

غالب نے کہا ہے:

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں عَرَض سے رتبۂ جوہر کھلا

غالب کے اس شعر سے ظاہر ہے کہ اردو میں شکوہ (شِ۔کوہ) مؤنث ہے۔

عاشورہ نہیں، عاشور

محرم کے مہینے کی دسوِیں تاریخ یعنی حضرت حسین رضی اللہ تعالی عنہ کے یومِ شہادت کو بعض لوگ عاشورہ (آخر میں 'ہ') لکھتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ اسے عاشور لکھنا چاہیے۔ اسے عاشوراء (یعنی الف کے بعد ہمزہ) بھی لکھا جاسکتا ہے۔ اس کا ایک اور املا عاشوریٰ (یعنی الف بشکلِ 'ی') بھی درست ہے، لیکن عاشورہ (یعنی آخر میں ہائے مختفی) غلط املا ہے۔

مستند اہلِ قلم کے ہاں اس کا املا 'عاشور' ہی ملتا ہے۔ اردو لغت بورڈ نے بھی اپنی لغت میں 'عاشور' کی اسناد شاہ نصیر، استاد ذوق اور میر انیس جیسے مسلّمہ اساتذہ کے کلام سے دی ہیں[18]۔ بلکہ شاہ نصیر کے شعر میں تو 'مغفور' کا قافیہ 'عاشور' ہے اور اسے 'عاشورہ' پڑھیں تو قافیہ درست نہیں رہے گا۔ ملاحظہ ہو:

لختِ جگر شہیدِ مغفور ہے ہمارا
اور زخمِ دل ہلالِ عاشور ہے ہمارا

ذوق کہتے ہیں:

تیغِ قاتل سے رہے جو قتل کے دن بے نصیب
عید کے دن کو نہ کیوں عاشور کا وہ دن کرے

'عاشور' کے علاوہ اردو میں عربی املا عاشوراء میں ہمزہ کی تخفیف کے بعد 'عاشورا' بھی رائج ہے اور سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی میں 'عاشورا' لکھا ہے[19]، البتہ لغت بورڈ نے اپنی لغت میں درست املا 'عاشور' اور 'عاشورا' کے ساتھ ایک دو اسناد کی بنیاد پر 'عاشورہ' (آخر میں الف کے بجائے ہائے مختفی) بھی لکھ دیا ہے لیکن ایک دو (اور وہ بھی کم تر درجے کی) اسناد کی بنیاد پر غلط املا کو سند بنانا صحیح نہیں ہے۔

حواشی:

۱. سرگذشتِ الفاظ (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۹ء)، ص ۱۲۷ (اشاعتِ دوم)۔
۲. فرہنگِ آصفیہ (مرتبہ سیّد احمد دہلوی) (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۷۷ء)۔
۳. اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد دوم (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۷۹ء)۔
۴. اردو املا (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۹۸ء)، ص ۹۱ (دوسرا ایڈیشن)۔
۵. فرہنگِ آنندراج (مرتبہ منشی محمد بادشاہ)، جلد دوم (لکھنؤ: نول کشور، ۱۸۹۴ء)، ص ۲۶۲۔
۶. A Comprehensive Persian-English Dictionary (مرتبہ ایف اسٹین گاس F.Steingass) (لاہور: سنگ میل ۲۰۰۰ء) (عکسی طباعت، اشاعتِ اول ۱۸۹۲ء)۔
۷. فرہنگِ فارسی (مرتبہ دکتر محمد معین) (در دو جلدی)، جلد اول، (تہران: انتشاراتِ ادنا، ۱۳۸۱ھ ش) (چاپ چہارم)
۸. فرہنگِ عمید (مرتبہ حسن عمید) (تہران: کتاب خانۂ ابنِ سینا، ۱۳۴۳ خورشیدی)۔
۹. خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) نے فرہنگِ زفانِ گویا (مرتبہ نذیر احمد) کی پہلی جلد ۱۹۸۹ء میں اور دوسری جلد ۱۹۹۷ء میں شائع کی۔
۱۰. لغت نامۂ دہخدا (مرتبہ علی اکبر دہخدا) جلد ہشتم (تہران: موسسۂ لغت نامۂ دہخدا، ۱۳۴۵)۔
۱۱. اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۱۱ (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۰ء)
۱۲. لغات الاصلاح (لاہور: مکتبۂ دانش، ۱۹۵۳ء)، ص ۱۸۶۔
۱۳. لغاتِ روزمرہ (کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۳)ء، ص ۱۳۸ (اشاعتِ دوم)۔
۱۴. اسٹین گاس، A Comprehensive Persian-Englis Dictionary محولۂ بالا۔
۱۵. لغاتِ روزمرہ، محولۂ بالا، ص ۱۵۳۔
۱۶. اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۱۲ (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۱ء)؛ نیز اسٹین گاس، محولۂ بالا۔
۱۷. ایضاً۔
۱۸. اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۱۳ (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۱ء)۔
۱۹. بحوالہ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۱۳، محولۂ بالا۔

A-337، بلاک 19، گلشنِ اقبال، کراچی، پاکستان
drraufparekh@yahoo.com

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین ومقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات ومضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق وتوازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری وتاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-

دوسری اور آخری قسط

عباس تابش: شعری سرقے کا تسلسل

کون کون شریکِ جرم

فرحت عباس شاہ

3- اسلوبی ڈاکہ (Stylistic Plunder)

یہ سرقے کی نسبتاً پیچیدہ مگر نہایت خطرناک قسم ہے۔ اس میں شاعر۔۔۔

* کسی معروف شاعر کے مخصوص اسلوب
* علامتی نظام — اور
* استعاروں کے مزاج

کو مسلسل نقل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کی اپنی آواز معدوم ہو جاتی ہے۔ عباس تابش کے ہاں یہ مسئلہ واضح ہے۔۔۔

* کہیں وہ فیض کے لہجے میں بولنے کی کوشش کرتا ہے تو کہیں فراز کے دکھ مستعار لیتا ہے۔
* کہیں قاصر، عدیم، یا منور رانا کی زمین میں سانس لیتا ہے تو کہیں نئے لکھنے والے معصوم نوجوان شاعروں کے کلام پر ہاتھ صاف کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی شاعری کسی فکری ارتقا اور اسلوبیاتی تسلسل اور موضوع کی شناخت سے عاری مجموعہ بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چوری شدہ ناموں پر لکھی گئی اس کی کتابیں کسی مربوط فکر کی حامل ہونے کی بجائے شعروں کا لنڈا بازار محسوس ہوتی ہیں جہاں ہر ہینگر پر کسی اور کا لباس ٹنگا ہے۔

4- موضوعاتی سرقہ (Thematic Theft)

یہ وہ سرقہ ہے جو سب سے زیادہ تہذیبی نقصان پہنچاتا ہے۔ اس میں شاعر کسی کے خیال کو اپنا تجربہ ظاہر کرتا ہے حالاں کہ اس کی ذاتی زندگی، مزاج اور کردار اس خیال کی نفی کرتے ہیں۔ مثلاً:

* ملنگی
* درویشی
* تصوف
* قناعت
* دردمندی

جب یہ موضوعات ایسے شخص کی شاعری میں آئیں جو عملی زندگی میں ان کے پاس سے ہو کر بھی نہ گزرا ہو، تو یہ تخلیق نہیں بلکہ جذباتی جعلسازی بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عباس تابش کے ہاں تصوف بھی مشکوک لگتا ہے اور محبت بھی ادھار محسوس ہوتی ہے۔

سرقے کی درجہ بندی کیوں ضروری ہے؟ اس لیے کہ جب ہم سرقے کو ایک مبہم الزام بنا دیتے ہیں تو اصل مسئلہ اوجھل ہو جاتا ہے۔ درجہ بندی یہ واضح کرتی ہے:

* کہاں چربہ ہے
* کہاں ترجمہ
* کہاں اسلوبی ڈاکہ
* اور کہاں موضوعاتی جعلسازی

یہ سب مل کر ایک مربوط بددیانتی کی تصویر بناتے ہیں۔

عباس تابش کا مسئلہ یہ نہیں کہ اس نے کچھ شعر چرا لیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس نے سرقے کو اپنا شعری وتیرہ بنا کر شعر کے سامع اور قاری کو بے وقوف بنایا۔ جو سیدھا سیدھا ایسا تہذیبی دھوکہ ہے جسے علمی، ادبی، لسانی اور اخلاقی سطح پر ناقابلِ معافی جرم قرار دیا۔ سادہ لفظوں میں عباس تابش اردو زبان و ادب کا ایسا دشمن ہے جس نے اپنے ناجائز فائدے کی خاطر دنیا بھر کی زبانوں اور ان میں تخلیق کیے گئے ادب کے سامنے شرمسار کروا کے رکھ دیا ہے۔ اردو کے ماتھے پر اس کا لگایا ہوا داغ صدیوں نظر آتا رہے گا کیوں کہ جب سرقہ نظام بن جائے تو پھر۔۔۔

* شاعر ختم ہو جاتا ہے
* شاعری باقی رہتی ہے، مگر جعلی
* اور ادب ایک اخلاقی بحران میں داخل ہو جاتا ہے۔

اگر عباس تابش جیسے شاعروں کو صرف انفرادی بددیانتی کی مثال سمجھ لیا جائے تو یہ خود فریبی ہو گی۔ اصل سوال یہ نہیں کہ ایک شخص نے چوری کیوں کی، اصل سوال یہ ہے کہ تیس برس تک یہ چوری کیسے چلتی رہی؟ اس سوال کا جواب کسی ایک شاعر کے کردار میں نہیں بلکہ مشاعراتی انتظام، تعلیمی نظام اور ادبی اداروں کی خاموش شراکت میں پوشیدہ ہے۔ جن بیوروکریٹس اور بااثر افراد نے اس مرض کی سہولت کاری کی ان کو تاریخ معاف نہیں کرے گی۔

ان تمام منتظمینِ مشاعرہ سے بھی سوال ہے کہ کیا آپ اعلان کریں گے کہ اب مشاعرہ تہذیبی روایت نہیں بلکہ کمرشیل انٹرٹینمنٹ اور کاروباری منڈی بن چکا ہے۔

اردو مشاعرہ اپنی اصل میں تخلیقی اظہار، فکری مکالمے اور زبان کی تہذیب کا مظہر تھا، مگر رفتہ رفتہ یہ ایک ایونٹ انڈسٹری میں بدل دیا گیا، جہاں جتنا نقص پیدا کیا جا سکتا ہے کیا جا رہا ہے۔ بیشتر مشاعروں میں اب شعر کی جمالیات نہیں، تالیاں معیار بن گئی ہیں، فکر کی گہرائی نہیں، فقرے بازی بکنے لگی ہے اور تخلیقی دیانت نہیں، شکلیں اور نیٹ ورک اہم ہو گیا ہے۔

اس ماحول میں عباس تابش جیسے لوگ فطری طور پر کامیاب ہوئے، کیوں کہ انھیں شعر کی نہیں، سامع کو نفسیاتی دھوکہ دے کر اپنی شناخت قائم کرنا تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج زیادہ تر غیر معیاری مشاعرے میں وہی شاعر چلتا ہے جو فوری داد سمیٹ لے، چاہے وہ داد کسی اور کے کلام پر ہی کیوں نہ ہو۔ جامعات، اکیڈمیاں، ادبی بورڈز اور ایوارڈ کمیٹیاں اگر چاہتیں تو یہ وبا ابتدائی مرحلے میں رک سکتی تھی، مگر ہوا اس کے برعکس۔

* سرقہ سب کو دکھائی دیتا رہا
* مگر کسی نے باضابطہ سوال نہیں اٹھایا
* کسی مقالے، نصاب یا فورم پر احتساب نہیں ہوا

یہ خاموشی معصوم نہیں تھی، یہ مفاداتی خاموشی تھی۔ کیوں کہ بہت سے اداروں کے لیے سچ بولنے سے زیادہ آسان یہ تھا کہ فوری مفاد کے ساتھ کھڑا رہا جائے۔

* بددیانت مدرسین اور جعلی مزاحمت

سب سے افسوس ناک کردار ناصر عباس نیّر جیسے ان مدرسین اور نقادوں کا ہے جنھوں نے سرقہ کرنے والوں کو مزاحمتی شاعر بنا کر پیش کیا اور ان پر تھیسس کروائے اور افتخار عارف اور تابش جیسے جعلی مفاد پرست اور چور شاعروں کے مصنوعی سطحی جذباتی نعروں کو فکری مزاحمت کا نام دیا اور طلبہ کو یہ سکھایا کہ یہ ناپسندیدہ آوازیں ہی شعور ہیں۔ دراصل یہ مدرسین وہی لوگ ہیں جنھوں نے اصل تخلیقی مزاحمت کو دفن کر دیا، کیوں کہ حقیقی مزاحمت اخلاص مانگتی ہے، قربانی چاہتی ہے اور سچ بولنے کی قیمت لیتی ہے جب کہ جعلی مزاحمت صرف اسٹیج، نعرہ اور داد چاہتی ہے۔

یہ المیہ ہے کہ آج اردو کی ترقی اور اردو سے محبت کے نام پر جعلی شاعروں کی اکثریت اور تخلیقی شاعروں کا مصنوعی قحط پیدا کیا جا رہا ہے۔ آج کا سب سے تلخ سچ یہ ہے کہ اردو شاعری کے نام پر ہونے والی کانفرنسوں اور فیسٹیولز میں ایسے لوگوں کو بطور خاص مدعو کیا جاتا ہے جن کے پاس اپنا شعر موجود ہی نہیں۔ یہ لوگ کہیں سے مصرع اٹھاتے ہیں، کہیں سے خیال، کہیں سے استعارہ اور پھر انھیں جوڑ کر معززینِ ادب کہلاتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آج کل سرقہ ایک وبا کی طرح تیزی سے پھیل رہا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ جب سرقہ کرنے والے شاعروں کو مسلسل مشاعروں میں نمایاں کیا جائے، سرقہ نصاب میں جگہ بنائے اور اداروں سے سندِ قبولیت حاصل کرے تو پھر یہ جرم صرف جرم نہیں رہتا، بلکہ وبا بن جاتا ہے اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ وبا میں قصور صرف مریض کا نہیں ہوتا، پورا ماحول بیمار ہوتا ہے۔

عباس تابش جیسے شاعر کسی خلا میں پیدا نہیں ہوئے، انھیں پیدا کیا گیا ہے۔ پہلے پہل عام معصوم لوگ اس کے ہتھے چڑھے، پھر بیوروکریٹس کو شاعر بن کر الو بنایا گیا حتیٰ کہ الحمد پبلشرز جیسے مستند چور پبلشرز کے ساتھ مل کر مالدار شوقینوں کو پہلے اصلاح کے نام پر چوری کے شعر لکھ کر دیے گئے پھر مہنگے داموں کتابوں کی ٹھیکے داری بھی کی گئی جو آج تک جاری ہے۔ اس کے بعد افتخار عارف جیسے درباری اور چور شاعر اور سفاک ادبی مافیائی مائنڈ سیٹ سے مفاداتی گٹھ جوڑ کی داستانیں بھی زبان زد عام ہیں۔ علاوہ ازیں مشاعراتی کاروبار، ادارہ جاتی خاموشی اور بددیانت فکری سرپرستی نے اردو زبان و ادب اور معاشرے کو وہ نقصان پہنچایا ہے جس کا ازالہ ممکن ہی نظر نہیں آتا۔ اب بھی وقت ہے کہ اس تہذیبی ہولناکی کا راستہ روکا جائے، لیکن یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک سرقے کو سرقہ نہیں کہا جائے گا، جعلی مزاحمت کو بے نقاب نہیں کیا جائے گا اور اداروں کو جواب دہ نہیں بنایا جائے گا، تب تک اردو شاعری میں اصل تخلیق اقلیت اور چربہ اکثریت بنتی جائے گی۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری ادراکی تنقیدی تھیوری (Perceptionism) کے مطابق تخلیق محض الفاظ کی ترتیب نہیں بلکہ شاعر کے ادراک، تجربے اور شعوری زاویۂ نظر جمالیاتی توسیع ہوتی ہے۔ اصل شعر وہاں جنم لیتا ہے جہاں شاعر کا داخلی ادراک، خارجی حقیقت سے ہم آمیز ہو کر ایک نیا معنی پیدا کرے۔ جب کوئی شخص دوسروں کے اشعار چرا کر پڑھتا ہے تو وہ دراصل ادراک کے عمل کو شارٹ سرکٹ کر دیتا ہے۔ وہ تخلیق نہیں کرتا، وہ صرف کسی دوسرے کے ادراک کی نقل کرتا ہے۔

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

> اردو مشاعرہ اپنی اصل میں تخلیقی اظہار، فکری مکالمے اور زبان کی تہذیب کا مظہر تھا، مگر رفتہ رفتہ یہ ایک ایونٹ انڈسٹری میں بدل دیا گیا، جہاں جتنا نقص پیدا کیا جاسکتا ہے کیا جا رہا ہے۔ بیشتر مشاعروں میں اب شعر کی جمالیات نہیں، تالیاں معیار بن گئی ہیں، فکر کی گہرائی نہیں، فقرے بازی بکنے لگی ہے اور تخلیقی دیانت نہیں، شکلیں اور نیٹ ورک اہم ہو گیا ہے۔

اردو دنیا

ندوۃ العلما لکھنؤ کے طلبہ کا جامعہ ملیہ اسلامیہ کا دورہ

نئی دہلی (19 جنوری)۔ ندوے کے شعبۂ تخصص فی الحدیث اور تخصص فی التفسیر کے طلبہ نے دو مرحلوں میں شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا دورہ کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ، طرزِ تعلیم اور کورسز کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر نسیم اختر ندوی نے طلبہ واساتذہ کا استقبال کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ، اس کی روایات، طرزِ تعلیم اور کورسز پر روشنی ڈالی۔ نیز انھوں نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عربی زبان اور اسلامی علوم کی تدریس اولین ایام سے جاری ہے اور ہندستان کے مشہور اساتذہ نے یہاں تدریسی خدمات انجام دی ہیں، جن میں مولانا محمد بن یوسف سورتی، مولانا اسلم جیراجپوری، عبدالسلام قدوائی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ کا قیام علی گڑھ میں عمل میں آیا، پھر قرول باغ منتقل ہوئی اور اب جامعہ نگر میں ترقی کی منزلیں طے کررہی ہے۔ اس موقعے پر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے استاد ڈاکٹر جاوید اختر نے اپنی تحقیقی کتاب 'جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اسلامی علوم کی ترقی میں اس کا حصہ' کی روشنی میں علمِ حدیث کے مطالعے وتحقیق میں جامعہ کے کردار پر روشنی ڈالی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے علمی وفکری کارناموں کو بیان کیا۔ طلبہ نے مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور صدر شعبۂ عربی نے اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے احادیث پر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جو تحقیقات ہوئی ہیں۔ ان سے متعارف کرایا۔ طلبہ کے ساتھ ندوۃ العلما کے شعبۂ تخصص فی التفسیر کے استاد مولانا فیصل بھٹکلی اور تخصص فی الحدیث کے استاد مولانا ابوسحبان روح القدس نے بھی پروگرام میں شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (انقلاب۔ دہلی)

جامع مسجد اردو میڈیم اسکول میں سالانہ جشن

نئی دہلی (24 جنوری)۔ ایس بی وی اردو میڈیم جامع مسجد اسکول میں سالانہ جشن اور یومِ جمہوریہ جوش وخروش کے ساتھ منایا گیا۔ مہمانانِ خصوصی کے طور پر پروفیسر محمد شاہد خاں نے جب کہ مہمانِ ذی وقار کی حیثیت سے ڈی ڈی ای زون 27، الکانا گپال، جامع مسجد پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او آدیش پرکاش نے شرکت کی۔ اسکول کے پرنسپل غیور احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا اور اسکول کی سالانہ کارکردگی پیش کی۔ تقریب کا آغاز پرچم کشائی سے ہوا جس کے بعد قومی ترانہ گایا گیا۔ اس موقعے پر طلبہ نے شاندار ثقافتی پروگرام پیش کیے۔ اس کے علاوہ طلبہ نے مختلف پریزنٹیشن جیسے ڈانس پرفارمنس، ایک ٹی ایل ایم (ٹیچنگ لرننگ میٹریلز) کی نمائش، اسٹریٹ ڈرامے، مونو ایکٹنگ اور اتحاد جیسے موضوعات پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ہر پریزنٹیشن نے اہم سماجی پیغامات پہنچائے اور ہم آہنگی، تعلیم اور قومی یک جہتی کو فروغ دیا۔ 'چائلڈ ود اسپیشل نیڈ' کے زمرے میں آنے والے طلبہ کے لیے خصوصی سیشن کا بھی اہتمام کیا، جس میں انھوں نے مشہور شخصیات کے لباس میں ملبوس فینسی ڈریس مقابلے میں حصہ لیا۔ ان کے اعتماد اور جوش نے سامعین کو متاثر کیا۔ پروگرام کے دوران مہمانِ خصوصی اور دیگر معززین نے اجتماع سے خطاب کیا اور طلبہ کو سخت محنت، نظم وضبط اور معاشرے میں مثبت کردار ادا کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے اسکول کے بامعنی اقدام کی تعریف کی اور طلبہ پر زور دیا کہ وہ جمہوریت، اتحاد اور تنوع کا احترام برقرار رکھیں۔ پروگرام کا اختتام ایوارڈ تقریب کے ساتھ ہوا، جس میں طلبہ اور اساتذہ کو کھیلوں وثقافتی سرگرمیوں اور مجموعی کارکردگی میں ان کی کامیابیوں پر میڈلز اور ٹرافیاں پیش کی گئیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

مولانا عبدالحلیم شررؔ اردو تہذیب، تاریخ اور فکری شعور کی زندہ علامت تھے

شررؔ کی خدمات کے اعتراف میں منعقد سمینار سے مولانا خالد رشید فرنگی محلی کا خطاب

لکھنؤ (17 جنوری)۔ اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک اور عائشہ افضال ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام ممتاز ادیب، مورخ اور صحافی مولانا عبدالحلیم شرر کی ہمہ جہت علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ایک عظیم الشان سمینار اور اعزازی تقریب عیدگاہ عیش باغ میں منعقد ہوئی۔ سمینار میں علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں کے افراد نے بڑی تعداد نے شرکت کی اور مولانا شررؔ کی فکری عظمت اور تہذیبی خدمات کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا۔ چیئرمین اسلامک سنٹر آف انڈیا مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے اپنے صدارتی خطاب کہا کہ مولانا عبدالحلیم شرر کی تحریریں اردو تہذیب کی فکری اساس کی نمائندہ ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے منتخب مضامین کو مختصر مگر مستقل بنیادوں پر شائع کیا جائے تاکہ نئی نسل ان کی فکر کے ذریعے تہذیبی تشخص سے ہمکنار ہوسکے۔ مہمانِ خصوصی ناظر عام دارالعلوم ندوۃ العلما مولانا سیّد عمار عبدالعلی حسنی ندوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ مولانا عبدالحلیم شرر کی تحریروں کا امتیاز مقصدیت، اصلاح اور تحقیق و جستجو ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کے لکھنے والوں کو اسی روایت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے جس کے سب سے بڑے داعی اور پیروکار مولانا شررؔ تھے۔ مولانا شمیم احمد ندوی نے اپنے خطاب میں اس نکتے کی طرف توجہ دلائی کہ مولانا عبدالحلیم شرر کا انتقال 1926 میں ہوا تھا اور 2026 میں منعقد ہونے والا یہ پروگرام گویا ان کی صدسالہ یادگاری تقریب کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا شرر کی صحافت، ناول نگاری، تاریخی ناول، ڈرامے اور افسانے اردو تہذیبی شعور کے تحفظ کا قیمتی سرمایہ ہیں، جن سے نئے صحافیوں اور ادیبوں کو رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ سمینار کا آغاز قاری طریق الاسلام کی تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا، جب کہ نظامت کے فرائض مولانا ذکی نور عظیم ندوی نے انجام دیے۔ خطبۂ استقبالیہ سیّد نورالحسن نے پیش کیا، جب کہ اشرف فردوسی ندوی نے منظوم انداز میں مولانا عبدالحلیم شرر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ سمینار میں پیش کیے گئے مقالات میں مولانا عبدالحلیم شرر کی تاریخ نگاری، تہذیبی شعور اور تخیلی اسلوب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ حقیق اللہ ندوی، ضیاء اللہ صدیقی ندوی، ڈاکٹر مسیح الدین خاں ندوی، احسان الحق اور محمد راشد خاں ندوی نے اپنے مقالات میں مولانا شرر کو اردو نثر کا ایک معتبر، عہدساز اور فکری رہنما قرار دیا۔

اس موقعے پر مختلف شخصیات کو ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں ایوارڈز پیش کیے گئے۔ مولانا خالد رشید فرنگی محلی کو ہمہ جہت خدمات ایوارڈ، مولانا سیّد عمار عبدالعلی حسنی کو تعلیمی وتنظیمی خدمات ایوارڈ، مولانا شمیم احمد ندوی کو فروغِ علم وادب ایوارڈ، عتیق فاروقی کو ثقافتی وتربیتی خدمات ایوارڈ، ڈاکٹر اکبر علی کو تدریسی خدمات ایوارڈ، ممتاز احمد ندوی نگرامی کو انتظامی خدمات ایوارڈ اور شوکت علی خاں کو مولانا عبدالحلیم شرر ایوارڈ برائے ترویج وترقی اردو زبان وادب سے نوازا گیا۔ تقریب میں ڈاکٹر ثروت تقی، امیر خالد، معروف خاں، ڈاکٹر حمیداللہ، معین علوی، ڈاکٹر عذرا بانو، پروفیسر بشریٰ بانو سمیت مختلف علمی، تعلیمی اور ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے اسکالرز نے بھی اپنے تحقیقی مقالات پیش کیے۔ آخر میں مولانا انس قمر ندوی نے اظہارِ تشکر پیش کیا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

44واں آن لائن آل انڈیا طرحی مشاعرہ

بزمِ سخن سیوہارہ (الہند) کے زیرِ اہتمام کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر

نجیب آباد، بجنور (24 جنوری)۔ اردو زبان وادب کی ترویج و اشاعت میں سرگرم فعال ادبی تنظیم بزمِ سخن سیوہارہ (الہند) کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والا چوالیسواں آن لائن آل انڈیا طرحی مشاعرہ نہایت کامیابی، خوش اسلوبی اور ادبی وقار کے ساتھ اختتام پذیر ہوا، جس میں ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے ممتاز، کہنہ مشق اور مبتدی شعرائے کرام نے اپنے معیاری اور فکرانگیز کلام کے ساتھ شرکت کی۔ یہ طرحی مشاعرہ معروف اور دل نشیں مصرعِ طرح 'برائے دید اظہارِ تمنا بھی ضروری ہے' پر منعقد ہوا، جس کے صاحبِ مصرع معروف شاعر ماسٹر عارف نیاز چاندپوری تھے۔ مشاعرے کے لیے ردیف 'بھی ضروری ہے' مقرر کی گئی، جب کہ مناسب قوافی کے ساتھ تمام شعرائے کرام نے وزن و بحر کی مکمل پابندی کرتے ہوئے اپنا کلام پیش کیا جسے اہلِ ذوق نے بے حد سراہا۔ اس آن لائن مشاعرے کی صدارت ممتاز دانی شخصیت قاری راشد حمیدی دھام پوری نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض خوش اسلوب شاعر ماسٹر گوہر ہلال سیوہاروی نے نہایت خوش سلیقگی اور سنجیدگی کے ساتھ انجام دیے۔ مشاعرے کی سرپرستی ماسٹر عارف نیاز چاندپوری اور ڈاکٹر محمد یاسین ذکی سرکڑہ نے فرمائی، جب کہ نگرانی و ترتیب کی ذمہ داری مفتی کفیل اطہر سیوہاروی (صدر بزمِ سخن سیوہارہ، الہند) اور قاری عبدالقدر حسرت حبیب والا (ناظرِ خصوصی بزمِ سخن سیوہارہ، الہند) نے بہ حسن وخوبی انجام دی۔ مہمانانِ خصوصی شناور کرت پوری (ضلع بجنور)، ضیاءالدین ضیا خیرآبادی، حذیفہ خالد عثمانی (مالیگاؤں)، علی اکرم انصاری (نورپور)، امین عبدالستار انصاری ساحل سردھنوی، انوارالحق فریدی، شاداں (سردھنوی، میرٹھی) اور مشاعرے میں شریک شعرائے کرام درجِ ذیل ہیں: محمد صابر گڑھی کانٹھ، سبطین پروانہ کٹیہاری (بہار)، ظفر حسین مرادآبادی، گلشن خیرآبادی، محبوب خیرآبادی، ایڈوکیٹ اقبال مودھوی، قمر خیرآبادی سیتاپوری، گھائل خیرآبادی سیتاپوری، مولانا محمد عابد سہس پوری، ڈاکٹر عبدالعزیز خیرآبادی، مرسلین ماہر میرٹھی، مولانا سراج الدین رہبر قاسمی (کانٹھ، مرادآباد)، اختر مجیبی خیرآبادی، ثروت دولت پوری کٹیہار، رئیس احمد راز نگینوی، حافظ مسعود محمودآبادی سیتاپور، محترمہ عالیہ گوہر (کریم نگر، تلنگانہ)، ماسٹر گوہر ہلال سیوہاروی، کفیل اطہر سیوہاروی، زید خیرآبادی سیتاپور، مولانا محمد رضوان قاسمی سیوہارہ، مولانا محمد طارق بجنوری (دہرہ دون)، قاری نوشاد عالم شاد علیگ، مولانا شمشیر احمد مظاہری، حکیم اسرارالحق نورپوری، سعیدالحسن خاں گہر خیرآبادی، مفتی افتخارالحسن حسن، مولانا اطہر کملاپوری اور نثار منظر سیوہاروی۔ تمام شعرائے کرام نے اپنے فکری، فنی اور اسلوبی اعتبار سے پختہ کلام کے ذریعے مشاعرے کو یادگار بنادیا۔ ادبی حلقوں میں اس آن لائن تحریری مشاعرے کو بے حد سراہا گیا اور بزمِ سخن سیوہارہ (الہند) کے اس مسلسل ادبی سفر کو اردو ادب کی خدمت کی ایک موثر اور بامقصد روایت قرار دیا گیا۔

(سیاسی تقدیر۔ دہلی)

القاضی اردو اکیڈمی کے ہونہار اردو طلبہ کو انعامات

ہمارا مقصد اردو تعلیم کو عام کرنا ہے: ڈاکٹر سیّد احمد خاں

نئی دہلی/مظفر نگر (19 جنوری)۔ مظفر نگر کے گاؤں کلیان پور میں اردو طلبہ اور طالبات کا ایک تحریری مقابلہ منعقد ہوا، جس میں دس بہترین طلبہ اور طالبات کو قیمتی انعامات سے سرفراز کیا گیا۔ عالمی یومِ اردو منتظمہ کمیٹی، نئی دہلی اور القاضی اردو اکیڈمی کی جانب سے منعقدہ اس تقریب میں مہمانِ خصوصی کے طور پر سینئر صحافی معصوم مرادآبادی، مہمانِ ذی وقار کے طور پر ڈاکٹر الیاس مظہر اور سوشل میڈیا کی معروف شخصیت سہیل نمبردار نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا مقصد اردو تعلیم کو عام کرنا ہے اور جو نئی نسل اس سے دور ہوتی جارہی ہے اُس کو اردو تعلیم و تدریس کی اہمیت سے روشناس کرانا ہے۔ ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے مزید کہا کہ مقابلے میں بچیوں نے بڑی کامیابی حاصل کی، یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ اس سے مادری زبان اردو کے فروغ میں بہت مدد ملے گی۔ اس موقعے پر معصوم مرادآبادی نے ہونہار اردو طلبہ کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ جو بچے اردو تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں اُن کے لب و لہجے اور گفتگو میں شائستگی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اپنی تاریخ اور تہذیب سے بھی واقف ہوجاتے ہیں، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو تعلیم کو گھر گھر پہنچایا جائے اور جو طلبہ اور طالبات بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کریں اُن کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

القاضی اردو اکیڈمی کی چیئر پرسن ایڈوکیٹ شاہ جبیں قاضی نے اس موقعے پر ہونہار طلبہ اور طالبات کے لیے بہترین تحفے اور شیلڈ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا بنیادی مقصد اردو پڑھنے والے طلبہ اور طالبات کی حوصلہ افزائی کرنا ہے تاکہ اس سے دیگر طلبہ بھی تحریک حاصل کریں۔ اس کام کے لیے ان دور دراز قصبوں اور گاؤوں کا انتخاب کیا گیا ہے جہاں عام طور پر فلاحی تنظیمیں نہیں پہنچ پاتیں، جن ہونہار طلبہ اور طالبات کو انعام و اکرام سے نوازا گیا اُن میں نکہت پروین، چاہت چودھری، صائمہ بیگم، سہانی بیگم، اقراٗ چودھری، سمیہ، ثنا، من تشا اور ذیشان شامل ہیں۔ یہ تقریب نواب میموریل پبلک اسکول، کلیان پور کے تعاون سے منعقد ہوئی۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں محترمہ خوشی، حنا، ادیبہ کے علاوہ عمیق چودھری، مومنہ چودھری، عرشی، نورین اور انم چودھری وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

ڈاکٹر تابش مہدی مرحوم کی یاد میں مشاعرہ

نئی دہلی (28 جنوری)۔ بزمِ تابش کے زیرِ اہتمام ایشیا کے عظیم نعت خواں استاد الشعرا، صحافی، ناقد اور محقق ڈاکٹر تابش مہدی کی یاد میں سربھی اسٹوڈیو نانگلوئی میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مولانا خورشید احمد الحسینی اور نظامت فخرالدین اشرف نے کی۔ تقریب کے روحِ رواں نورالعین قیصر قاسمی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر شاہ اجمل فاروق ندوی نے شرکت کی۔

اس موقعے پر ڈاکٹر تابش مہدی مرحوم کے تعلق سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر منور حسن کمال اور ڈاکٹر حبیب سیفی نے ان کی تصنیفات و تخلیقات کو ادب کا بیش بہا سرمایہ قرار دیا اور ان کی اصلاحات کے طریقِ کار پر گفتگو کی۔ اہم شرکا میں شہزاد عالم، محمد جاوید قاسمی، ڈاکٹر عظیم، رفیق ملک، کلیم خاں، نوید عالم انصاری، نوشاد عالم اور آفاق عالم انصاری قابلِ ذکر ہیں۔ اس موقعے پر شاہ اجمل فاروق، ڈاکٹر منور حسن کمال، ڈاکٹر حبیب سیفی، نورالعین قیصر قاسمی، سہیل عباس سیوانی، قاسم شمسی، عبدالرحمٰن منصور، شہادت علی نظامی، رضوان صبا، منیش مدھوکر، شاکر دہلوی، سرفراز احمد فراز، یونس ملک، آشیش سنہا، حشمت بھاردواج، ڈاکٹر ارشد قمر، انوارالوفا، احترام صدیقی اور جاہل لکھنوی نے بھی اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔ (انقلاب۔ دہلی)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

طاہر فراز

ممبئی۔ اردو زبان وادب کے معروف شاعر طاہر فراز کا 25 جنوری 2025 کو انتقال ہوگیا۔ جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر عام ہوئی ادبی حلقوں میں غم و اندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ ذرائع کے مطابق طاہر فراز گھریلو تقریب میں شرکت کے لیے ممبئی گئے ہوئے تھے جہاں اتوار کی صبح دل کا دورہ پڑا اور انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ طاہر فراز دبستانِ رام پور کے نمائندہ شاعر تھے۔ ان کی پیدائش 29 جون 1953 کو بدایوں کی اسی سرزمین پر ہوئی جو شاعری کے لیے بڑی زرخیز مانی جاتی ہے۔

طاہر فراز بظاہر مشاعروں کے مقبول ترین شاعر تھے لیکن ان کا شعری آہنگ آج کے شاعروں سے بہت بلند تھا۔ ان کے شعری مجموعے 'کشکول' کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں سوشل میڈیا پر ان کے چاہنے والوں کی طرف سے تعزیتی پیغامات کا سیلاب آگیا جس میں اردو سے محبت کرنے والوں نے مغموم انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سوشل میڈیا پر ادبی شخصیات نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ طاہر فراز کے لب و لہجے میں جو سادگی تھی، وہی ان کی شخصیت کا پرتو بھی تھا۔ طاہر فراز مشاعروں میں بڑے پُرسوز ترنم سے اپنا کلام سناتے تھے اور جب وہ گویا ہوتے تو سناٹا چھا جاتا تھا۔ ان کی غزلیں تہذیب کا آئینہ ہیں جس میں درد بھی تھا اور سچائی بھی۔ ان کی آواز میں ایک کشش تھی۔

پرواز رحمانی

نئی دہلی۔ اردو کے مشہور و ممتاز صحافی اور سہ روزہ 'دعوت' کے سابق مدیر پرواز رحمانی کا 5 جنوری 2026 کو انتقال ہوگیا۔ 6 جنوری کو بعد نمازِ ظہر شاہین باغ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کی عمر تقریباً 70 برس تھی۔ تدفین میں جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ ساتھ علاقے کی سرکردہ شخصیات اور بڑی تعداد میں صحافیوں نے بھی شرکت کی جن میں معصوم مرادآبادی، سہیل انجم اور قاسم سیّد وغیرہ شامل ہیں۔ واضح ہو کہ پرواز رحمانی الشفا اسپتال میں زیرِ علاج تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

پرواز رحمانی صاحب ایک اصول پسند اور سنجیدہ صحافی تھے۔ انھوں نے اردو صحافت کو محض اطلاع و ابلاغ کا ذریعہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ذہنی و فکری رہنمائی اور سماجی شعور کو بیدار کرنے کا ایک موثر وسیلہ بنایا۔ ان کے انتقال سے اردو صحافت ایک ایسے قلم کار سے محروم ہوگئی جنھوں نے حق گوئی، دیانت اور سنجیدہ صحافت کو اپنی شناخت بنایا۔

ڈاکٹر محمد منظور عالم

نئی دہلی۔ ملک کے معروف دانشور، ماہرِ اقتصادیت و عمرانیات اور محروم طبقات کے حقوق کے علمبردار ڈاکٹر منظور عالم 12 دسمبر 2025 کی صبح اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ انھیں ہندستان اور عالمِ اسلام میں تعلقات کی ایک مضبوط کڑی مانا جاتا تھا۔ وہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز (آئی او ایس) کے بانی و سرپرستِ اعلا اور آل انڈیا ملّی کونسل کے جنرل سکریٹری تھے۔ وہ کئی دنوں سے دہلی کے میکس اسپتال کے انتہائی نگہداشت یونٹ میں زیرِ علاج تھے، جہاں انھوں نے 80 برس کی عمر میں آخری سانسیں لیں۔ وہ طویل عرصے سے صاحبِ فراش تھے۔

پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کی تجہیز و تدفین بعد نمازِ مغرب شاہین باغ قبرستان میں عمل میں آئی، جس میں ہر مکتبِ فکر کی اہم شخصیات نے شرکت کی۔ اس سے قبل جسدِ خاکی کو آخری دیدار کے لیے شاہین باغ میں ان کی رہائش گاہ پر رکھا گیا تھا۔ دو مرتبہ جنازے کی نماز ہوئی، جس میں سیکڑوں افراد نے شرکت کی۔ ایک نمازِ جنازہ شاہین مسجد اور دوسری شاہین باغ قبرستان میں ہوئی۔ شاہین مسجد میں نمازِ جنازہ سابق ڈین شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر محمد سعود قاسمی نے پڑھائی۔ جنازے میں ملک و ملّت کی نامور شخصیات کی کثیر تعداد شریک تھی۔

ڈاکٹر منظور عالم 9 اکتوبر 1945 میں رانی پور، ضلع مدھوبنی، بہار میں ایک متوسط کاشتکار کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد عبدالجلیل تھا، ابتدائی و ثانوی تعلیم و تربیت آبائی گاؤں میں ہوئی، گریجویشن مدھوبنی کے آر. کے. کالج سے کیا۔ اعلا تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا جہاں سے معاشیات میں پی ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ سعودی عرب کی وزارتِ خزانہ اور قومی اقتصادیات میں اقتصادی مشیر کے عہدوں پر فائز رہے۔ امام محمد بن سعود یونیورسٹی (ریاض) میں ایسوسی ایٹ پروفیسر، کنگ فہد ہولی قرآن پرنٹنگ کمپلیکس (مدینہ منورہ) میں دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن پاک کے ترجمے کے چیف کوآرڈینیٹر، ہندستان میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ملیشیا (IIUM) کے نمائندے، اسلامک ڈیولپمنٹ بینک اسکالرشپ پروگرام برائے غیر رکن ممالک کی جنرل کمیٹی کے رکن تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے مسلسل دو مرتبہ ممبر بھی رہے۔ وہ فی الوقت انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ، امریکہ کے بورڈ ممبر، انٹرنیشنل اسلامک چیریٹیبل آرگنائزیشن، کویت کے بانی ممبر، اسٹیرنگ کمیٹی استنبول مذاکرات، سول سولیڈریٹی پلیٹ فارم استنبول (ترکی) اور ایمنٹ پرسنز گروپ آف ورلڈ اسلامک فورم (ترکی) کے ممبر تھے۔ اسی طرح ہندستان میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز (آئی او ایس) نئی دہلی کے بانی چیئرمین اور سرپرستِ اعلا، تعاون ٹرسٹ (نئی دہلی) کے چیئرمین، آل انڈیا ملّی کونسل کے جنرل سکریٹری، انڈو عرب اکنامک کوآپریشن فورم (نئی دہلی) کے صدر، ہندستان اور بیرونِ ملک ایک درجن سے زیادہ دیگر تنظیموں اور اداروں کے مینیجنگ ڈائرکٹر اور ممبر تھے۔ مرحوم کو بین الاقوامی علمی دنیا میں غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ وہ سعودی عرب سے شائع ہونے والے امریکن جرنل آف اسلامک سوشل سائنسز (MEDAD) کے انٹرنیشنل ایڈوائزری بورڈ کے ممبر تھے، کویت سے شائع ہونے والے جریدے 'المنہاج' کے انٹرنیشنل ایڈوائزری بورڈ کے ممبر اور مالدیپ یونیورسٹی کے بین علومی ریسرچ جرنل کی مجلسِ مشاورت کے بھی ممبر تھے۔ ان کی رحلت کی خبر سے ملک و بیرونِ ملک علمی، سیاسی اور سماجی حلقوں میں غم و اندوہ ہے۔ ملک و ملّت کی نامور شخصیات نے ان کے انتقالِ پُرملال پر اظہارِ تعزیت کیا ہے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

محفلِ شعر و سخن کپل وستو، نیپال کی جانب سے بعنوان 'ایک شام سالک بستوی کے نام' مشاعرے کا انعقاد

کرشنا نگر (22 جنوری)۔ 20 جنوری 2026 رات 9 بجے کُل نیپال و ہند مشاعرے کا انعقاد بیادِ معروف شاعر جناب سالک بستوی عمل میں آیا، جس میں ہند و نیپال سدھارتھ نگر، بستی، گونڈہ، گورکھپور اور نیپال کے متعدد شعرا نے شرکت کی۔ اس مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر ایاز اعظمی نے کی اور صدارت کے فرائض نیپال کی سب سے قدیم ادبی تنظیم انجمن ارتقائے اردو ادب کے صدر زاہد آزاد جھنڈا نگری نے انجام دیے۔ حمد و نعت کے بعد محترم زاہد آزاد نے اپنے صدارتی کلمات میں محترم سالک بستوی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ...

(بقیہ صفحہ 7 پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : منشی ہرگوپال تفتہ
(غالب کے ایک عزیز شاگرد)
مصنف : ڈاکٹر احمد حسن ندوی
اشاعت : 2024
ضخامت : 286 صفحات
قیمت : 350 روپے
ناشر : روز ورڈ بکس، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-25
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابراہیم افسر

E-mail: ibraheem.siwal@gmail.com

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بعد مرزا غالبؔ کے چہیتے اور عزیز شاگردوں میں منشی ہرگوپال تفتہ کا شمار ہوتا ہے۔ مرزا غالبؔ نے منشی ہرگوپال تفتہ کے نام 137 خطوط رقم کیے۔ منشی ہرگوپال اپنے کلام پر غالبؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا اصل میدان فارسی شعروسخن تھا۔ ان کے معاصرین فارسی گوشعرا میں غالبؔ، شیفتہ، آزردہ، صہبائی، نیاز احمد بریلوی اور شاہ تراب علی قابلِ ذکر ہیں۔ حالاں کہ عہدِ مغلیہ کے زوال کے بعد ہندستان میں فارسی شاعری کا سورج غروب ہوگیا تھا۔ تفتہ جیسے فارسی گوشعرا کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ حق دار تھے۔ مغلیہ حکومت کے زوال اور غدر کے واقعات کو تفتہ نے اپنی مثنوی 'سنبلستان' میں دل دوز انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

رفت آبروی ہند نہ تنہا ہمین بہ باد
در ہر ولایتی در آیی ہوا یکیست

(نہ صرف ہند (دہلی) کی آبرو خاک میں مل گئی بلکہ جس صوبے میں جایئے یہی صورتِ حال نظر آئے گی۔)

منشی ہرگوپال تفتہ سکندر آباد میں 1214-1215ھ مطابق 1799-1800 کو پیدا ہوئے اور یہیں پر 2 ستمبر 1879 (15 رمضان 1296ھ) کو انتقال کیا۔ ابتدا میں تفتہ رامی تخلص رکھتے تھے اور قتیل کے شاگرد تھے، حالاں کہ مرزا غالبؔ نے قتیل کے بارے میں تفتہ کے نام لکھے خطوط میں سخت کلامی سے کام لیا ہے۔ اس کے باوجود تفتہ کے دل میں قتیل کے لیے عظمت وعزت کا گوشہ برقرار رہا۔ تفتہ کے نام لکھے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ غالب نے تفتہ کے کلام کی خوب تعریف کی ہے۔ غالب نے ایک مدت کے بعد تفتہ کو فارغ الاصلاح قرار دے دیا تھا۔ اس بارے میں غالب لکھتے ہیں: ''تمھارا کلام پختگی کو پہنچ گیا، اصلاح طلب نہیں رہا... اب مشق تمھاری پختہ ہوگئی، خاطر میری جمع ہے... تم خوش گوار اور زود گو مقرر ہو'' (ص 7)۔ غالب نے ہی ان کے نام میں مرزا کا اضافہ کیا اور تخلص تفتہ رکھا۔ خود غالب اس بارے میں کہتے ہیں:

مرا مرزا تفتہ خود خواند غالب
چہ نازی کہ بر میرزایی ندارم

ڈاکٹر احمد حسن ندوی کی تحقیق کے مطابق ہرگوپال تفتہ نے غالب کی شاگردی 1837 میں اختیار کی۔ یہ سلسلہ غالب کی وفات تک برقرار رہا۔ تفتہ، غالب کی نظر میں صرف شاگرد ہی نہیں تھے بلکہ ایک مخلص دوست اور اولاد کی مانند تھے۔ غالب نے تفتہ کو لکھے خطوط میں جگہ جگہ 'شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ'، 'کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ'، 'خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں' اور مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے۔ معاذ اللہ تم سے اور آزردگی'' وغیرہ القاب سے یاد کیا۔

منشی ہرگوپال تفتہ نے متفرق ملازمتیں کیں۔ انگریزی محکمۂ بندوبست میں قانون گو کے عہدے پر فائز رہے، لیکن شعروسخن سے دل لگی کے سبب نوکری کو خیر باد کہا۔ کچھ عرصہ ریاستِ جے پور میں ملازمت کی۔ کاشی پور ٹھاکر دوارا (مراد آباد) کی تحصیل داری میں کام کیا۔ بقولِ ڈاکٹر احمد حسن ندوی انھوں نے اپنی ملازمتوں کے سلسلے کو مثنوی سنبلستان میں لکھا کہ میرا پیشہ نوکری ہے جس پر مجھے فخر ہے اور جس سے بالا تری حاصل ہے ... تیس سال کی عمر یعنی 1830 میں ملازمت کے لیے بریلی آیا پھر بریلی سے لکھنؤ اور وہاں سے کان پور چلا گیا۔ اس دوران کسی سے رشوت نہیں لی۔ مطعون ہوا نہ کسی کا احسان لیا۔ خدا اب دال روٹی دیتا ہے اور اپنے گھر میں شاہی کرتا ہوں (ص 62)۔ تفتہ نے اپنی زندگی کے کچھ ایام 'کول' (علی گڑھ) میں بھی گزارے۔ غالب نے کول کا ذکر تفتہ کے نام لکھے خطوط میں بھی کیا ہے۔ تفتہ کے احباب میں ظہور علی، جانی بانکی لال، منشی نول کشور، رضی الدین خاں وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن ندوی نے زیرِ نظر کتاب میں منشی ہرگوپال تفتہ، ان کا عہد، ملازمت، تعلیم و تربیت، ازدواجی زندگی، ملازمت، تفتہ کے شب و روز، تفتہ کا مذہب، آغازِ شعرگوئی، غالب اور دیگر فارسی شعرا مثلاً سعدی، امیر خسرو، احسن دہلوی، حافظ، کمال خجندی، بابا فغانی شیرازی، فیضی وحشی باقی، محتشم کاشانی، عرفی، نظیری، ظہوری، اسیر، حزین ... کے کلام کے ساتھ تفتہ کے کلام کا موازنہ کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں تفتہ کی فارسی شاعری، غزل، قصیدہ، رباعیات، قطعات، مخمسات اور دیوانِ اول، دوم وسوم، مثنوی سنبلستان، تضمین گلستان وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن ندوی نے منشی ہرگوپال تفتہ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے دیوان کو ایک 'عالمِ تصور' سے تعبیر کیا ہے۔ تفتہ نے فارسی شاعری کے تمام بڑے کلاسکی اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری کے موضوعات میں تنوع جا بجا موجود ہے۔ خود ان کے سامنے مرزا غالب جیسے قادرالکلام شاعر موجود تھے جنھوں نے تفتہ کی شاعری میں نکھار پیدا کیا۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے اپنے دیوان کے متعلق لکھا کہ جس طرح البم میں انواع واقسام کی چھوٹی بڑی حسین وجمیل اور دل کش ودل ربا تصویریں ہوتی ہیں اسی طرح میرے دیوان میں مختلف موضوعات سے متعلق انواع واقسام کے دل کش ودل ربا مضامین ہیں:

چو ہست عالم تصویر جملہ دیوانم
رقم بہ خامہ بہزاد می توان کردن

حالاں کہ منشی ہرگوپال تفتہ نے اس بابت یہ بھی لکھا کہ جب میرا دیوان ہی تمھارے سامنے ہے تو منہ میاں مٹھو بن کر اپنی شاعری کی تعریف کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔

ہست دیوانم چو پیشت وصف شعر خود چہ سود
نام یوسف چون برم کاروان پیداست کیست

منشی ہرگوپال تفتہ نے غزل کی طرح قصیدہ نگاری میں بھی کمال پیدا کیا۔ تفتہ کے قصیدوں کی تعریف غالب نے ان کے نام لکھے خطوط میں بھی کی ہے۔ حالاں کہ غالب نے خط کے آخر میں تفتہ کو قصیدے سے متعلق کچھ مشورہ اور تنبیہ بھی کی۔ خط ملاحظہ کیجیے:

''میاں مرزا تفتہ! ہزار آفریں! کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ چشم بد دور، تسلسلِ معنی سلاست الفاظ۔ ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارد ہوا۔ یہ بھی محلِ فخر وشرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا، وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع یہ ہے:

چاک گردیدم واز جیب بہ دامان رفتم

پہلا مصرع تمھارا اگر اس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔ خدا تم کو اتنا جلائے کہ ایک دیوان بیس جز قصائد کا کہہ لو مگر خبردار! قصائد بہ قیدِ حروفِ تہجی جمع نہ کرنا۔'' (ص 242)

بہرکیف! ڈاکٹر احسن ندوی نے عہدِ غالب کے ایک اہم فارسی شاعر منشی ہرگوپال تفتہ کے حالاتِ زندگی اور ان کی شعری عظمت کے بارے میں زیرِ نظر کتاب میں مکمل احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں جگہ جگہ یہ بتانے کی کوشش کی کہ تفتہ کے حالاتِ زندگی زیادہ بہتر نہیں تھے۔ انھوں نے قانون گو کے عہدے پر ملازمت ضرور کی لیکن متفرق ملازمتیں بھی کیں۔ تفتہ کے بیٹوں کا عین جوانی میں انتقال ہوا جس کی وجہ سے وہ تاعمر پریشان رہے۔ عہدِ مغلیہ کے زوال کے بعد جس تیزی سے فارسی زبان کا زوال ہندستان میں ہوا اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ تفتہ کی وفات کے بعد فارسی شاعری کا سلسلہ بھی جلد ہی ختم ہوگیا۔ لوگوں نے فارسی زبان کے بجائے انگریزی تعلیم کو ترجیح دینا شروع کیا۔ کتاب پر تقریظ پروفیسر محمد اقبال (سابق صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے لکھی ہے۔ اس موقع پر راقم ڈاکٹر احسن ندوی کو مبارک باد پیش کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے فارسی زبان کے لیے لکھے مقالے کو اُردو زبان میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔

☼☼☼

حالی اور علی گڑھ تحریک

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

زبان وادب کی ترویج واشاعت اور ارتقا میں بہت اہم ہیں۔ شبلی اور سرسیّد کے درمیان نظریاتی طور پر اختلاف رہا۔ شبلی سرسیّد کی بہت سی تعلیمی پالیسیوں اور دیگر معاملات سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد شبلی نے اعظم گڑھ واپس جاکر 'دارالمصنّفین' کے نام سے ایک علمی و تحقیقی ادارہ قائم کیا جو آج بھی سرگرمِ عمل ہے اور 'معارف' نام کا ایک تحقیقی وعلمی مجلّہ وہاں سے شائع ہوتا ہے۔

جہاں تک خواجہ الطاف حسین حالی اور سرسیّد کے باہمی افکار و خیالات اور نظریات کا تعلق ہے۔ حالی ہمیشہ سرسیّد کی نیت اور عمل سے واقف بھی تھے اور مطمئن بھی رہے۔ سرسیّد کی تعلیمی واصلاحی تحریک میں خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنا نظریہ ابتدا ہی سے ہمیشہ واضح رکھا اور اپنی تخلیقات اور دیگر تحریروں میں سرسیّد سے ذہنی مطابقت کو واضح کیا ہے اور اس کا اظہار بھی کیا۔ مثلاً تعلیمِ نسواں، مساواتِ نسواں نیز عورتوں کے مسائل اور دردمندی کا احساس اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔

'مناجاتِ بیوہ' میں خواتین کے درد، سماج میں ان کی بدحالی اور ان کے ساتھ بدسلوکی کو شاعری کے تناظر میں پہلی بار حالی نے اپنی مخصوص تخلیقی انداز میں پیش کی ہے جب کہ سرسیّد ابتدا میں تعلیمِ نسواں کے زیادہ حق میں نہیں تھے۔

حالی سرسیّد کے افکار ونظریات، تعلیمی تحریک اور اصلاحِ معاشرہ کے ہمیشہ حامی رہے۔ حالی نے مختلف سطحوں پر اپنی نظم ونثر دونوں ہی طرح سے سرسیّد کے مشن کو تقویت بخشی۔ سرسیّد کے بعد خواجہ الطاف حسین حالی علی گڑھ تحریک کے لیے ایک اہم اور مستحکم ستون ثابت ہوئے جو یقیناً ایک عظیم تخلیق کار ہونے کے باوجود ملک وملّت کے لیے دردمند دل رکھتے تھے۔

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ-202002، یوپی
E-mail: zia_musafe@yahoo.co.in

عباس تابش: شعری سرقے کا تسلسل، کون کون شریکِ جرم

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

میری نظر میں سرقہ دراصل ادرا کی بانجھ پن کی علامت ادرا کی تیوری کے تناظر میں سرقہ ایک اخلاقی مسئلہ ہونے سے پہلے ادرا کی بانجھ پن ہے کیوں کہ سرقہ کرنے والا شاعر کسی نئے تجربے سے نہیں گزرا، کسی فکری تصادم سے نہیں ٹوٹا اور کسی داخلی سوال سے نہیں جلا، اسی لیے وہ دوسروں کے تجربات مستعار لیتا ہے۔ یہاں مسئلہ یہ نہیں کہ اس کے پاس الفاظ نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پاس اپنا ادراک نہیں۔

ناصر عباس نیّر جیسے نالائق اور چور نقادوں پر واضح کرتا چلوں کہ ادرا کی تنقید ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ ہر چیخ مزاحمت نہیں ہوتی۔ حقیقی مزاحمت وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں شاعر جبر اور طاقت کے نشے کو اپنے ادراک سے توڑتا ہے اور قاری کے شعور میں نیا زاویہ پیدا کرتا ہے۔

عباس تابش جیسے ناموں کو مزاحمتی شاعر کہنا دراصل مزاحمت کے تصور کی توہین ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جو غریب الفکر سامع سے وقتی اور سطحی واہ واہ تو کراتی ہے مگر اس کے شعور میں کوئی نئی کھڑکی نہیں کھولتی۔ اسی طرح مشاعراتی زبوں حالی اور ادراک کی مسخ شدگی کا معاملہ بھی تکلیف دہ ہے۔ موجودہ مشاعراتی نظام نے ادراک کو فکر کے بجائے فوری اور سطحی ردعمل تک محدود کر دیا ہے۔ اب شعر اس لیے نہیں کہا جاتا کہ کچھ دریافت کیا جائے، بلکہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ سامعین سیٹیاں بجائیں، ہنسیں، نعرہ بازی ہو اور اسے داد کہا جائے۔ یہ نظام شاعر کو سوچنے والا ذہن بنانے کے بجائے پرفارمنس دکھانے والا فنکار بنا رہا ہے، اور جب ادراک کی جگہ اداکاری آ جائے تو سرقہ فطری نتیجہ بن جاتا ہے۔ اس حوالے سے جامعات کی چشم پوشی اور ادبی اداروں کی خاموشی Perceptionism کے مطابق ایک ادرا کی جرم ہے کیوں کہ اداروں کا کام صرف اسناد دینا نہیں، بلکہ شعور کی تشکیل، ادراک کی درستی اور تخلیقی اخلاقیات کی حفاظت ہے۔ جب ادارے جعلی شعروں پر مشتمل کتابوں اور متشاعروں کو وقعت دیتے ہیں تو وہ آنے والی نسلوں کے ادراک کو مسخ کرتے ہیں۔

میری اس تحریر کو کسی ایک یا چند مخصوص افراد یا ادبی جتھے کے خلاف نہ سمجھا جائے، یہ اردو ادب کے ضمیر کا مقدمہ ہے بلکہ یہ اس تمام آلودگی کے پیچھے چھپے بیٹھے غلیظ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ادب کا مقدمہ ہے۔ دراصل عباس تابش یا افتخار عارف یا ناصر عباس نیّر جیسے دو نمبر کے لوگ مسئلہ نہیں، یہ محض علامتیں ہیں، ایک ایسے نظام کی جو سرقے کو کامیابی، سطحیت کو مزاحمت اور شور کو شعور سمجھنے لگا ہے۔ ادرا کی تھیوری ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ جب تک شاعر کا ادراک آزاد، دیانت دار اور ذاتی نہ ہو، اس وقت تک کوئی شعر تخلیق نہیں کہلا سکتا۔ آج اردو شاعری کو کسی نئے رجحان کی نہیں، ادبی دیانت کی بازیافت کی ضرورت ہے۔ یہ وقت ہے کہ سرقے کو کھل کر سرقہ کہا جائے، جعلی مزاحمت کو مسترد کیا جائے اور مشاعرے کو دوبارہ تہذیبی فورم بنایا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اردو شاعری باقی تو رہے گی، مگر اس کی جمالیاتی، فکری اور نظریاتی حیثیت مر جائے گی اور یہی غلیظ سرمایہ دارانہ نظام کی منصوبہ بندی ہے کیوں کہ ادراک کے بغیر ادب صرف شور رہ جاتا ہے تخلیق نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کا تقاضا ہے کہ میں آخر میں اپنی سفارشات ریاست کے ان مخلص عمال تک پہنچاؤں جن کو پہلے ہی ہماری ثقافت اور تہذیب کے خلاف غیر روایتی اتحاد کا اچھی طرح پتا ہے اور افتخار عارف اور عباس تابش جیسے ادیبوں کی بعض ملکوں سے غیر علانیہ مگر گہری وابستگی کا بھی پورا پورا علم ہے۔

ادبی دیانت، ادراک اور تخلیق کی بازیافت کے ضمن میں ہم ایسے تمام ہم فکر و ہم نظریہ شعرا و ادبا یہ اعلان کرتے ہیں کہ اردو ادب کی بقا کسی نئے فیشن، نئے نام یا نئے اسٹیج میں نہیں، بلکہ ادبی دیانت، آزاد ادراک اور خالص تخلیق میں ہے۔ ہم اس تصور کو مسترد کرتے ہیں کہ، بے ہنگم داد ہی معیار ہو، شور ہی مزاحمت ہو اور نقل کو مہارت کہا جائے۔ ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شاعر کی پہچان اس کے اپنے کلام سے ہو نہ کہ اس کی آواز، اس کے حلقے، یا اس کے مشاعراتی روابط سے۔ ہم مانتے ہیں کہ ادب صرف تفریح نہیں، یہ شعور کی تشکیل، ادراک کی توسیع اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ سرقے کو جرم سمجھا جائے اور اکیڈمی آف لیٹرز و مجلس ترقی ادب جیسے اداروں میں تعیناتی، ادبی جرائم کا حصہ یا نیکسس کے ممبرز کی نہ کی جائے اور جو پہلے سے موجود ہیں ان کی خاموشی کو شراکتِ جرم مانا جائے اور جعلی مزاحمت کو علمی سطح پر رد کیا جائے۔

یاد رہے کہ یہ منشور کسی فرد کے خلاف نہیں، یہ نظام کی اصلاح کے لیے اجتماعی عہد ہے۔ ادبی احتساب کے لیے دس نکاتی فریم ورک۔

1- ادرا کی معیار: ہر شاعر کے کلام کا تجزیہ اس کے ادرا کی زاویے سے ہو اور تجزیہ کرنے والے مدرسین یا جعلی ناقدین کی بجائے حقیقی ناقدین ہوں جو خود اعلا تخلیقی تجربے کے حامل ہوں۔ ادب اور سماج کے ساتھ ان کا اخلاص ثابت ہو۔ کسی کے بھی تخلیق کیے گئے ادب کی تائید سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ وہ نیا معنی پیدا کر رہا ہے یا پرانا دہرا رہا ہے۔

2- سرقہ کی واضح تعریف: سرقے کو مبہم اصطلاح کے بجائے ادبی، اخلاقی اور ادرا کی سطح پر واضح کیا جائے۔

3- مشاعراتی اسکریننگ: مشاعروں میں شرکت سے قبل شاعر کے کلام کی تحقیقی اور تنقیدی جانچ لازم ہو۔

4- جامعات کی ذمہ داری: ادبی ادارے اور جامعات صرف ڈگری دینے والے مراکز نہ ہوں، بلکہ ادبی دیانت کے نگہبان بنیں اور سطحی و سستی جذباتیت سے آلودہ شاعری کرنے والوں کو بطور شاعر ہرگز مدعو نہ کیا جائے تاکہ طالب علموں کی اخلاقیات تباہ نہ ہو۔

5- نقاد کی جواب دہی: ہر نقاد پر لازم ہو کہ وہ اپنی تنقید میں ذاتی تعلق، گروہ بندی اور مفاد سے بالاتر رہے۔

6- ان بیوروکریٹس اور بااثر افراد، منتظمین اور اسپانسرز پر نظر رکھی جائے اور انھیں سماجی اقدار پر حملہ آور ہونے کے جرم میں قانون اور انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے جو ادب کے نام پر بے ادبی پھیلانے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

7- دستاویزی ثبوت: ہر بڑے شاعر کے کلام کی اشاعت، تاریخ اور ماخذ دستاویزی صورت میں محفوظ کی جائے۔

8- عوامی آگاہی: قاری اور سامع کو یہ سکھایا جائے کہ ہر مقبول شعر عظیم تخلیق نہیں ہوتا۔

9- ادبی اخلاقیات کا نصاب: تعلیمی سطح پر ادبی اخلاقیات کو باقاعدہ مضمون کی حیثیت دی جائے۔

10- آزاد ادبی فورم: ایسے غیر جانبدار فورمز قائم کیے جائیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے جہاں سرقہ، بددیانتی اور ادارہ جاتی خاموشی پر بلاخوف بحث ممکن ہو۔

آخری اعلان

یہ دستاویز کسی ادبی گروہ کے لیے نہیں، یہ اردو ادب کے مستقبل کے لیے ہے۔ یاد رکھیں اگر آج ہم نے ادراک، دیانت اور تخلیق کا ساتھ نہ دیا تو کل ہمارے پاس شاعری تو ہوگی مگر شعور نہیں ہوگا اور جہاں شعور نہ رہے وہاں ادب صرف آواز بن جاتا ہے جو معاشرے کو ایسی تہذیبی اور فکری خلا کا شکار بنا دیتا ہے جہاں ہر وقت ہر طرف افراتفری، اضطراب، ڈپریشن اور جہالت پنپنا شروع ہو جاتی ہے۔ ہمارے پاس تہذیبی تباہی سے پہلے یہ آخری موقع ہے کہ ادب کو ادب کی طرح برتا جائے۔

03214468216

محفلِ شعر وسخن کپل وستو، نیپال کی جانب سے بعنوان 'ایک شام سالکؔ بستوی کے نام' مشاعرے کا انعقاد

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

ہوئے کہا کہ جناب سالک بستوی ہند و نیپال میں عموماً اور قرب و جوار کے اضلاع میں خصوصاً اردو شاعری کے حوالے سے اپنی ایک خاص شناخت رکھتے تھے۔ وہ ایسی عظیم شخصیت کے مالک تھے، جن کی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے، جس سے معاشرے میں اچھے اثرات مرتّب ہوئے۔ اردو ادب اور شعر و سخن کے حوالے سے بات کی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ 'نغمۂ دلنواز' سے لے کر 'جرم تبسم' تک ان کی کئی کتابیں قارئین سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں، طلبہ ان کتابوں سے منتخب نظموں سے اپنی انجمن کی زینت بڑھاتے ہیں۔ اجلاسِ عام اور مختلف محفلوں میں جناب سالک بستوی کے نغمے، حمد و نعت اور نظمیں گنگنائی جاتی ہیں، یہ جناب سالک بستوی کی شاعری کے حوالے سے مقبولیت کی واضح مثال ہے۔ نیپال کے معروف عالمِ دین حضرت مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری نے جناب سالک بستوی کی کتاب 'جرم تبسم' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: 'زیرِ نظر مجموعۂ کلام 'جرمِ تبسم' میں بسی ہوئی نکہت غزل نہ تو ایسی تیز ہے کہ مشامِ جاں معطر ہونے کی بجائے مکدر ہو جائے اور نہ کچھ ایسی ہلکی کہ قریب جا کر بھی مہک سے محروم رہنا پڑے۔ شاعر نے توازن کو کہیں بھی شکایت کا موقع نہیں دیا، ہر جگہ اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے جو ایک سخنور کی امتیازی صفت ہے':

امامت سج رہی ہے جاہلوں کی
قیامت کی نشانی لکھ رہا ہوں

راہبر کو یہ کون سمجھائے
رہبری رہزنی نہیں ہوتی

امیرِ شہر کی محفل سے کیا ملے گا مجھے
ملا جو مجھ کو غریبوں کی انجمن سے ملا

ادیبِ عصر مولانا ابوالعاص وحیدی حفظہ اللہ جناب سالک بستوی کی شاعری کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں: برادرِ عزیز جناب سالک بستوی ایک دردمند اور باذوق شاعر ہیں جن کی نظمیں اور غزلیں دینی اور ادبی مجلّات میں شائع ہوتی رہتی ہیں اور بہت پسند کی جاتی ہیں۔ اس نوعمری میں شاید کم ہی لوگ ہوں گے جنھوں نے سالک صاحب کی طرح بہت لکھا ہو اور بڑی مقبولیت حاصل کی ہو، میں اس کامیابی پر سالک صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ جناب سالک بستوی کی دینی خدمات کے حوالے سے بات کی جائے تو انھیں چند سطروں میں سمویا نہیں جا سکتا۔

ہم ایک بار پھر ان کی شاعری کے حوالے سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جناب سالک بستوی نے شعر و سخن کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی اور بہت کامیاب رہے ہیں، ان کی شاعری اسلامی پیکر میں ڈھلی ہوئی خوب صورت امتیازی شان رکھتی تھی۔ اسی حیثیت سے انھوں نے اپنی شناخت بنائی اور ہم عصر شعرا میں مقبولیت و محبوبیت سے نوازے گئے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس سے نوازے۔ ہم مبارک باد پیش کرنا چاہتے ہیں محفلِ شعر و سخن کے ذمے داران کو، جنھوں نے جناب سالک بستوی کی یاد میں 'ایک شام سالک بستوی کے نام' کی، ایسی محفلوں کے انعقاد سے اردو ادب کی خدمت بھی ہوتی ہے اور شعرا کی خدمات کا بھرپور اعتراف بھی۔ ہم سامعینِ کرام کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے اپنی شرکت سے اس مجلس کو کامیابی سے ہمکنار کیا، اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

حالیؔ اور علی گڑھ تحریک

ضیاء الرحمٰن صدیقی

انقلاب 1857 کی ناکامی کے بعد ہمارا ملک پوری طرح برطانوی سامراج کے شکنجے میں آگیا۔غیر ملکی نوآبادیاتی نظام نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا تھا، اسی کے ساتھ ایک نئی تہذیب نے جنم لیا۔ ہمارے اہلِ قلم نے جب انگریزی ادب سے مقابلہ کیا تو محسوس کیا کہ شاعری اور نثر میں عشق و عاشقی اور فرضی قصّے کہانیاں ادب کے حصار میں رکاوٹ کا باعث ہوسکتی ہیں۔ ادب کی خوش بختی یہ رہی کہ اُسے بلند قامت نثر نگار میسر آئے جن کی معیاری تحریروں نے اردو زبان و ادب کے ذہنی اُفق کو بلندی عطا کی اور یہ دور سرسیّد احمد خاں کی رہنمائی میں اردو نثر کا عہدِ زرّیں ثابت ہوا۔

سرسیّد احمد خاں اُنیسویں صدی کے عظیم رہنما، مصلح اور دانش ور تھے۔ 1857 کی ناکامی کے بعد یہ قوم بے عملی، بدحالی اور بے راہ روی کا شکار ہوگئی۔ انگریزوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ مسلمانوں نے علم بغاوت بلند کیا ہے، اسی لیے انگریزوں کی انتقامی کارروائیاں مسلمانوں کے خلاف تیز تر ہوتی گئیں۔

سرسیّد نے مسلمانوں کی اصلاح، رہن سہن اور انھیں مذہب کی اصل روح سے آشنا کیا۔ اردو نثر کو بھی سرسیّد نے ایک نئی سمت و رفتار عطا کی۔ سرسیّد نے اردو نثر کو مبالغہ آرائی، لفاظی، تصنع اور قافیہ پیمائی جیسے عیوب سے قطع نظر سادہ، سلیس اور عام فہم طرز اختیار کرنے کی جانب توجہ مبذول کرائی۔ اس کے لیے انھوں نے مذہبی اور اصلاحی نوعیت کے مضامین بھی تحریر کیے۔

سرسیّد ایک علم دوست اور آسودہ حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اجداد مغلیہ سلطنت میں اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ سرسیّد کی تربیت میں ان کی والدہ نے اہم کردار ادا کیا۔

1857 کا انقلاب انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ’تاریخ سرکشی بجنور‘ اور ’اسباب بغاوتِ ہند‘ جیسی اہم تصانیف لکھ کر انھوں نے یہ واضح کردیا کہ سرکار کی غلط پالیسی اس بغاوت کی ذمہ دار تھی، بعدازاں انھوں نے ’لائل محمڈنز آف انڈیا‘ میں یہ واضح کیا کہ مسلمان انگریزی سرکار کے بدخواہ نہیں ہیں۔ انھوں نے ولیم میور کی کتاب ’لائف آف محمدؐ‘ کا جواب ’خطباتِ احمدیہ‘ کے ذریعے دیا۔ انگلستان میں انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ہندستان واپس جاکر ’تہذیب الاخلاق‘ کے نام سے ایک رسالہ جاری کریں گے۔ اس کے ذریعے انھوں نے سلیس اور رواں اردو کو رواج دیا۔

انگلستان سے واپس آکر سرسیّد نے MAO کالج قائم کیا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ تعلیمی ادارے قائم کرنے اور انھیں مزید فروغ اور استحکام بخشنے کے لیے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ بیسویں صدی کا عظیم تعلیمی مفکر، اُردو نثر میں نئی جان ڈالنے والا محسن 27 مارچ 1898 کو داغِ مفارقت دے گیا۔ سرسیّد نے اردو نثر کے ساتھ اردو شاعری کو بھی جلا بخشی۔ حالی نے سرسیّد کی فرمائش پر ’مسدس مدوجزر اسلام‘ لکھی۔ سرسیّد خود نثر نگار تھے۔ انھوں نے نثر کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔

سرسیّد نے قلم کاروں کا ایک مخصوص حلقہ بھی تیار کیا۔ جوان کے رفقا میں شامل تھے۔ ان میں محسن الملک، چراغ علی، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، ذکاء اللہ اور علامہ شبلی کے علاوہ اردو نثر کو فروغ دینے میں محمد حسین آزاد اور سیّد احمد دہلوی کے نام بھی اہم ہیں۔

محسن الملک (1837-1907) اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ ڈپٹی کلکٹر تھے بعدازاں حیدرآباد میں انسپکٹر جنرل کے عہدے پر رہ کر خدمات انجام دیں۔ 1893 میں علی گڑھ واپس آگئے۔ 1907 میں شملہ میں انتقال ہوا۔ سرسیّد کے بعد محسن الملک ہی ان کے جانشین رہے۔ انھوں نے سرسیّد کے افکار و خیالات کو پھیلانے میں مدد کی۔ ان کی نثر بہت دلکش ہے۔ ان کے خطوط آج بھی بہت شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی (1837-1914): مذہب ان کا خاص موضوع تھا۔ سرسیّد کے ہم نوا اور ہم خیال تھے۔ ’تہذیب الاخلاق‘ میں حالی سرسیّد کے خاص رفقا میں سے تھے۔ بلند پایہ نثر نگار، نقاد، سوانح نگار اور اچھے شاعر تھے۔ ’مجالس النساء‘ ان کی پہلی اہم تصنیف ہے۔ یہ خواتین کی تعلیم سے متعلق ہے۔ بعدازاں ’حیاتِ سعدی‘، ’یادگارِ غالب‘، ’حیاتِ جاوید‘ ان کی اہم سوانحی کتابیں ہیں۔ غالب کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے۔ حالی کی سب سے اہم تصنیف ’مقدمۂ شعر و شاعری‘ ہے۔ آلِ احمد سرور نے اسے اردو کا پہلا منشور کہا ہے۔ مدوجزرِ اسلام عرف مسدس حالی ان کا اہم تخلیقی کارنامہ ہے۔ انجمنِ پنجاب کے ذریعے انھوں نے ’اردو نظم‘ کو نئی سمت و رفتار عطا کی۔

ڈپٹی نذیر احمد (1836-1912): اردو کے پہلے ناول نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے کلامِ پاک کا بامحاورہ ترجمہ کیا۔ اخلاق و مذہب پر ان کی کتابوں میں ’الحقوق والفرائض‘، ’امہات الامہ‘، ’مواعظِ حسنہ‘ اہم ہیں۔ انھوں نے انڈین پینل کوڈ کا ’تعزیراتِ ہند‘ کے نام سے ترجمہ کیا۔ وہ اچھے مقرر بھی تھے۔ ان کے خطبات بھی شائع ہوچکے ہیں۔ عربی زبان پر انھیں مہارت حاصل تھی۔ پانچ ناول لکھے۔ ’ابن الوقت‘ ان کا اہم ناول ہے۔ ’تہذیب الاخلاق‘ میں بھی پابندی سے مضامین لکھتے تھے۔

ذکاء اللہ (1832-1910): دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کالج کے پروردہ تھے۔ نذیر احمد، محمد حسین آزاد اور ذکاء اللہ تینوں یہیں کے پروردہ تھے۔ ان تینوں کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ آگرہ کالج میں کچھ عرصہ اردو فارسی پڑھائی۔ انھیں ریاضی کے مضمون سے بھی خصوصی دلچسپی تھی۔ وہ میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں عربی، فارسی کے استاد رہے۔ مولانا حالی ان کے دماغ کو بنیے کی دُکان کہا کرتے تھے۔ انھوں نے ریاضی، جغرافیہ، تاریخ اور سیاست پر قلم اُٹھایا ان کی تصانیف کی تعداد 142 ہے۔ ’تاریخِ ہندستان‘ ان کی سب سے اہم کتاب ہے۔ ’شمس العلماء‘ کا خطاب بھی ملا۔ انگریزی پر انھیں عبور حاصل تھا۔ انگریزی میں ان کے متعدد علمی مضامین شائع ہوئے۔

شبلی نعمانی (1857-1914): صرف 57 برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ بندول اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ والد وکیل تھے۔ شبلی نے بھی وکالت کا امتحان پاس کیا۔ بعدازاں سرکاری ملازمت کی اور استعفیٰ دے دیا۔ 1882 میں علی گڑھ آئے اور سرسیّد کے رفقا میں شامل ہوگئے۔ حکومت کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ شبلی کی اہم تصانیف میں المامون، الفاروق، سیرت النبیؐ، علم الکلام، شعرالعجم، موازنۂ انیس و دبیر ہیں۔ سیرت النبیؐ ان کی آخری تصنیف ہے جو وفات کے سبب نامکمل رہی۔ سیّد سلیمان ندوی نے اسے مکمل کیا۔ تحقیق شبلی کا مزاج تھا، ان کے مضامین و مکاتیب ادب کا اہم سرمایہ ہیں۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ کی بنیاد ڈالی اور اپنی تمام جائیداد اس کے لیے وقف کردی۔

اردو نثر کی تاریخ میں یہ عہد، عہدِ زرّیں ہے۔ بہت سے بلند پایہ مصنف اور نثر نگار پیدا ہوئے، ان کی گراں قدر تصانیف اردو نثر کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔

اس دور کے نثر لکھنے والوں میں وحیدالدین سلیم، مہدی افادی، ناصر دہلوی، دلگیر الٰہ آبادی وغیرہ اہم ہیں۔ اس عہد کے قلم کاروں نے اردو نثر کو فصاحت بخشی اور بلند طرزِ تحریر عطا کیا۔

علی گڑھ تحریک اردو نثر اور خصوصاً اردو ادب کے فروغ اور ترویج و اشاعت کے لیے سنگِ میل ثابت ہوئی۔ اس تحریک کو باضابطہ ادبی رنگ دینے میں دو اہم نام سامنے آتے ہیں، خواجہ الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی۔ ان دونوں کی علمی و ادبی خدمات اردو ...(بقیہ صفحہ 6 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by *Abdul Bari* on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: *Dr Ather Farouqui*